آبِ نیساں

آبِ نیساں

آبِ نیساں

فرید پربتی

Scanned with CamScanner

AAB - E - NAISAN
by
FAREED PARBATI

کتاب ـــــ آبِ نیساں

مصنف ـــــ فرید پربتی

سرورق ـــــ الطاف ملک

تعداد ـــــ ایک ہزار

سنہ اشاعت ـــــ ۱۹۹۱ء

قیمت ـــــ لائبریری ایڈیشن ۱۵۰/=

تقسیم کار:-

- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس. لال کنواں دہلی
- مکتبہ علم وادب، ریڈکراس روڈ سرینگر
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی روڈ (علی گڑھ)
- شبخون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد ۳
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
- حسامی بک ڈپو۔ چارمینار (حیدر آباد)
- لال پوری بک سیلرز، حول چوک سرینگر

اِنتساب

اپنے والدین
اور بہن غزالہ میر
کے نام

خود کو میں بانٹ نہ ڈالوں کہیں دامن دامن
کر دیا تم نے اگر میرے حوالے مجھ کو

قتیلؔ شفائی

سونی اور آلی

کی نذر

منظر نامہ

نظمیں

غزلیں :-

یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی کے
جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

ــــــــــــ لگ بھگ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں ایک نئے تخلیقی دور کا آغاز ہوا تخلیق شعر کے ضمن میں خارجیت اور مقصدیت کے بجائے داخلیت اور جمالیاتی اثر آفرینی پر زور دیا جانے لگا، چنانچہ گزشتہ بیس پچیس برسوں میں شعری اور افسانوی ادب کے جو نمونے پیش کئے گئے اور پیش کئے جا رہے ہیں، وہ کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے ایک نئے تخلیقی دور کی نشاندہی کرتے ہیں، شعری رویے میں تبدیلی کا یہ عمل نہ صرف ملک کی مختلف زبانوں کے ادب میں نمایاں ہے، بلکہ تقریباً ہر علاقے اور خطے کے ادیبوں اور شاعروں کے ذہن و فکر کا ایک لازمی حصّہ بن چکا ہے، کشمیر میں بھی نئی نسلوں کے شعور و فکر اور لسانی آگہی میں تبدیلی کا یہ عمل فروغ پا رہا ہے۔ یہ تبدیلی اتنی نمایاں ہے کہ ایک نئی حرارت بخش شعری فضا کا احساس ہوتا ہے، اس فضا میں کئی نوجوان شعراء اور افسانہ نگار (اردو اور کشمیری) ملکی اور علاقائی زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی صورتِ حال کے حوالے سے شخصی کوائف و واردات کا ادراک کرنے کی سعی میں معروف نظر آتے ہیں، فرید پربتی بھی جواں سال شاعر ہیں، وہ نہ صرف نئی

شعری فضا کے زائیدہ ہیں بلکہ اپنے اشعار کی رخشندگی سے اس فضا کی تابناکی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ فرید پربتی نئی غزل کے شاعر ہیں، نئی غزل موجودہ دور کے بحران کی تجسیم کاری کے لئے لفظ و پیکر کے علامتی امکانات کو حتی الامکان بروئے کار لاتی ہے۔ فرید پربتی نہ صرف موجودہ بحرانی صورت حال کا احساس رکھتے ہیں، بلکہ وہ الفاظ کے ایمائی امکانات کی کھوج لگانے کی ضرورت کا بھی شعور رکھتے ہیں، یہ شعور و احساس اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر زندگی اور حقیقت کے بارے میں ایک انفرادی نقطۂ نظر قائم کرتا ہے، ظاہر ہے، اسی صورت میں اُس کے فکر و احساس کا انداز بدل جاتا ہے، یہ عمومیت کے بجائے اختصاصی ہونے پر اصرار کرتا ہے، نتیجے میں مروجہ اسالیب اظہار کی ایک نئی تشکیل کی ضرورت آن پڑتی ہے، فرید پربتی کی جو غزلیں میری نظر سے گذری، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کو اپنی نظر سے دیکھنا چاہتے ہیں، اور پھر اپنے مشاہدات و احساسات کو اپنے اسلوب میں پیش کرنا چاہتے ہیں، یہ دراصل اپنے وجود سے متعارف ہونے کا عمل ہے ——— اپنے وجود کے اندر مخفی شعری ذخائر تک رسائی کا عمل، جو بہت کٹھن اور صبر آزما ہے، لیکن منزل یابی کے لئے ناگزیر ہے، فرید پربتی نے اسی دشوار گزار راستے پر قدم رکھا ہے امید ہے کہ وہ اپنی لگن، ذوق اور آگہی کی مدد سے اپنی منزل کو پالیں گے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری
وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی

ــــــــــ ریاست جموں و کشمیر میں اردو شاعری کے میدان میں ایک نئی آواز کا اضافہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہی شعری مجموعوں کی فہرست میں ایک نئے مجموعے کا اضافہ تحیر آمیز ہے۔ کیونکہ اردو شعر و ادب کا حلقہ اب اس قدر وسیع و عریض ہوگیا ہے جہاں نہ تو تحریک کی ضرورت باقی ہے اور نہ انگیخت کی۔ بلکہ نئی کلیاں از خود چٹختی ہیں اور قافلۂ رنگ و بو کی بہاریں شریکِ حال ہوتی ہیں۔ پھر یہ الگ بات ہے کہ کن گلوں کی مہک مشامِ جان کو معطر کرتی ہے اور کون سی بو زمانے کی تیز ہواؤں میں حلول کر کے بے نام ہوجاتی ہے فرید پربتی ریاست کے دبستانِ شعر کی ایک ایسی ہی آواز ہے۔ جسکے متعلق میں قطعاً یہ فیصلہ نہیں دونگا کہ وہ اچھا شعر کہتے ہیں یا بُرا۔ وہ بھرپور کہتے ہیں یا ہلکا۔ اُنکا مذاق سنجیدہ ہے یا آوارہ یہ فیصلہ کرنا تو اصحابِ نقد کا ہی کام ہے مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ فرید اور انکی شاعری کو میں نے گذشتہ بارہ تیرہ سال سے کافی قریب سے دیکھا ہے لہذا اُنکے بارے میری ایک جچی تُلی رائے بھی ہے۔ فرید کو اُس زمانے سے جانتا ہوں جب اُنہوں نے ابھی لکھنا شروع نہیں کیا تھا اور اسلامیہ کالج میں بزمِ ادب کی مجالسِ ادب سے تحریک لیکر اُنہوں نے اپنے

احساسات کو قرطاس وقلم کے حوالے کرنا شروع کردیا۔ اس زمانے میں انکی شاعری بھی وہی تھی جو ہر مبتدی کی ہوتی ہے۔ اُنکی راہ میں بھی وہی رکاوٹیں حائل تھیں۔ جو ہر نووارد کے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتی ہیں مگر مستقل مزاجی، بے پناہ محنت اور جذبے کی شدّت نے اُنکی مشکلات کو آہستہ آہستہ آسان کردیا اور وہ بہت سے ایسے شاعروں سے بہتر اور عمدہ شعر کہنے لگے جو اکثر اردو کے رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں اور مشاعروں میں داد وصول کرلیتے ہیں۔

یہ مجموعۂ کلام "اُبر تر" کے بعد فرید پربتی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جسمیں گزشتہ آٹھ سالہ کاوشوں کا انتخاب ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ انکی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے کافی قریب ہے۔ انکی شاعری میں عصر حاضر کی تمام تلخیاں، محرومیاں اور بے معنویت ایک ایسے اظہار کے قالب میں ڈھلتی ہیں جو غزل کا مرغوب تر اظہار ہے انہوں نے میرؔ، ناصر کاظمی، شکیب جلالی، اور باقیؔ کے لہجے سے یقیناً مثبت اثر لیا ہے مگر اپنی آواز کو ان اثرات کے وزن تلے دبنے سے بچالیا ہے میں یہ تو نہ کہوں گا کہ فریدؔ لہجوں کے اس موتناژ میں اپنا علاوہ لہجہ تراشنے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر انکی ہر غزل یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ ایک منفرد لہجے کو تراشنے میں مصروف ہیں اور اگر انکی یہ کوشش اسی طرح جاری رہی تو ضرور اپنے لئے ایک الگ لہجہ بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

فریدؔ شاعری کی لفظیات کو گھسے پٹے انداز میں استعمال کرنے کے بجائے نئے نئے پیکر تراشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ استعاروں اور علامتوں کو نئے نئے SHADES کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے وہ خود کہتے ہیں ؎

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے
یہ کاروبار پرانا نیا نیا سا لگا

انکے اشعار میں عصری مسائل کا ردعمل نہایت ہی بے ساختہ اور خودرو ہے جو کامیاب شاعری کی بڑی ضمانت ہے وہ اپنی محدود COMMITMENT کو اظہار کی سلاست روی میں سدِ راہ نہیں بننے دیتے ہے

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر کہ بکتی دھوپ ہے ایک اک دکاں پر
کرائے دار سے ہوشیار رہنا کہیں قابض نہ ہو جائے مکاں پر

ے اس جگہ تم نے مجھ کو چھوڑ دیا جس جگہ سبزہ ہے نہ پانی ہے
اب سلامت مکان ہے نہ مکیں کیا یہی تیری پاسبانی ہے

ہم کہ محروم ہیں چراغ سے بھی
وہ کہ سورج کے بادشاہ ہوئے

بے سمتی اور خود گم گشتگی کے پیدا کردہ قنوطی زاویوں میں الجھی پھنسی زندگی جدید شاعری کا مرغوب ترین موضوع رہا ہے ان الجھے ہوئے نشیب و فراز کا حیاتی ردعمل اور ان سے پیدا ہونے والا داخلی تضاد ہی نئی شاعری کا موضوعِ فکر ہے۔ فرید زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں اسکے کرب کو محسوس کرتے ہیں اور تب کہیں جا کے اپنے تجربے کو نوکِ قلم پر لاتے ہیں۔ اگرچہ ان تجربات میں قطعیت نہیں، مگر مسلسل تغیر پذیر اور ہر دم بدلتے ہوئے انطباقات کے اسی دور میں یہ قطعیت ضروری بھی نہیں۔ ہے

رنج کی بات کر رہے ہیں لوگ حد سے آگے گزر رہے ہیں لوگ

کاغذی ناؤ یہ کیا پار اتارے گی فرید خود کو نادان تماشا نہ بنا پانی پر

ماحصل سے بے یقیں کر کے فرید مرحلوں کا دردِ سر مجھ کو دیا

اُنکی شاعری میں بصری استعاروں کا غلبہ ہے جیسے سرو و چنار' دشت و سراب' آئینہ' سمندر' ستارے' دیوار' بگولہ' غبار' سائے' بادباں' اوس' آندھی' درخت' پھوار' خار و خس' کشتی' کھیتی مکان' پرندے' شاخ' برگ و شجر' ثمر' شمع' چراغ' کشکول' گھر' چولہا' سحاب' بھنور' تیغ و تبر' تیر و سناں' تیلیاں' وغیرہ بصری استعاروں کا زیادہ استعمال اگرچہ اشعار کو بعض اوقات گراں بار بناتا ہے۔ مگر ان کا استعمال اگر بمحل اور چست انداز میں کیا جائے تو یقیناً یہ شاعری کے مشاہداتی پہلو کو جاندار بناتا ہے انکا استعمال شعر کو سادگی اور گفتگو کا رنگ بخشتا ہے نیز پس پردہ جذبے کی شدت اور پیش پردہ ہیئتی تجربات کو تصویر بنا کر آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔

فریدؔ کو زبان و بیان اور عروض و آہنگ پر بھی عبور حاصل ہے۔ وہ جذبات کو فنی قیود کے باوجود برتنے کا بھرپور حوصلہ رکھتے ہیں اور مشکل ترین زمین میں بھی اپنی مخصوص رنگ و بُو کے پھول کھلانے پر قادر ہیں انہیں مشق سخن کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے مطالعے کے ذوق سے بھی نوازا ہے جس سے انہیں اپنے تجربات کو دوچند کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

مختصراً فریدؔ پربتی کی شاعری ایک جنگلی ندی کی لااُبالی کیفیت کے مصداق ہے جو ناہموار اور کھُردری زمیں پر گزرنے کے باوجود اپنے آہنگ کو برقرار رکھتی ہے اور ہر گزرنے والے پل کے تغیّراتی ساگر میں گرنے کے باوجود بھی اُسے فنا نہیں ہونے دیتی۔ ☆

جاوید آذر

سرینگر کشمیر۔

تصدیر

ـــــــ ـــ ابرِ تر (۱۹۸۸ء) کے بعد دوسرا شعری مجموعہ "آبِ نیساں" میرے ابتدائی زمانے کے کلام سے لیکر اِس وقت تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ دراصل اِس مجموعۂ کلام سے میرے قارئین کو میری فکر اور میرے فن کے ارتقائی مدارج کا ایک گراف (GRAF) بنتا جائے گا۔ لیکن موضوع کا وہ تنوع جو زندگی کی طرح شاعری کو بھی ہمہ رنگ بناتا ہے شاید زیادہ نمایاں نہ ہو سکے اور اسلوب کی وہ اِکائی بھی متعین نہ ہو سکے جو ایک زاویہ سے شاعر کی پہچان بن جاتی ہے۔

اسلوب کی اِنفرادیت، ندرت اور یگانگت اہم ضرور ہوتی ہیں مگر اِس حد تک نہیں کہ اِس کی تلاش میں شاعری کا سفر گردِ سفر میں گم ہو کر رہ جائے اور شعر کا معنوی رشتہ اپنے عہد سے کٹ جائے۔ میرے نزدیک شاعری زندگی کے تنقیدی ادراک سے بھی عبارت ہے اور اس ادراک کے سوتے تاریخ و تہذیب کے جدلیاتی عمل اور اُسکے نتائج میں اپنے عہد کے سائنٹفک تجزیے سے پھوٹتے ہیں اور شاعر اس آگہی کا ابلاغ

شعر کی زبان میں فراہم کرتا ہے۔ علامت و استعارہ اسی ابلاغ کے وسیلے ہیں۔ اگر یہ وسیلہ اس قدر ذاتی اور داخلی ہو جائے کہ اپنے آئینے میں اپنی ہی شکل پہچانی نہ جا سکے۔ تو شاعری بے چہرہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے دور میں جدیدیت ایک ایسے ہی المیئے سے دوچار ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میرا آئینہ پتھر نہ بن سکے۔ اس آئینے میں چہرہ بہ چہرہ وہ تسلسل برقرار رہے جو روایت میں جدت کا ضامن ہے۔ میرے لئے تصوف انکشاف ذات کا ایک اہم وسیلہ ہے شاید اسی لئے میرا ئیں یعنی شاعر، عاشق اور سپاہی ہمیشہ نئے نئے معرکے سر کرنے کی طرف راغب رہتا ہے ؎

عاقل زہست گوید و عارف زنیستی
من درمیانِ آب و گلِ ہستم و نیستم

فرید پربتی

بیت الحبیب، سنگین دروازہ، رعناواری
سرینگر ۳ (کشمیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد

سمیع کہنا، البصیر کہنا، علیم کہنا، حکیم کہنا
وہ اپنی عظمت سے خود ہے واقف اُسے تو ربِ عظیم کہنا

نوازشیں کیا، عنائیتں کیا، ہے باغ و بن کی روش روش پر
گلوں کو نکہت، کلی کو رنگت، عطا ہے کس کی نسیم کہنا

دِلوں کے سب بھید جانتا ہے صدا صدا ہے اُسی پہ روشن
رحیم ورحمٰں صفت ہے اُسکی اُسے تو ربِ کریم کہنا

●●

نعت

خُدا کا دُلارا فرشتوں کا پالا
محمدؐ ہمارا بڑی شان والا

وہ نُورِ تجلّا وہ رحمت کا پیکر
کیا جس نے حُسنِ جہاں کو دوبالا

میری خوش نصیبی ہے رشکِ ملائک
میرا تذکرہ ہے سرِ عرشِ اعلےٰ

ہو تحریر میری کہ تقریر میری
مَیں کرتا ہُوں ذِکرِ نبیؐ لامحالا

مَیں رکھتا ہُوں دِل محو ذِکرِ نبیؐ میں
صَبا ہو مَسا ہو کہ صیف و سیالا

آبِ نیساں

اے قدر دانِ کمال حاتمؔ دیکھ
عاشق و شاعر و سپاہی ہے

شاہ حاتمؔ

● —— غزلیں
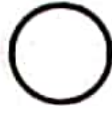
خلوص و مہر کی طرزِ ادا نہ راس آئی
تمہارے شہر کی آب و ہوا نہ راس آئی

مَیں جانتا ہوں کہ ماتم کا ماحصل کیا ہے!
اِسی لئے مجھے آہ و بُکا نہ راس آئی

بجی بجھی ہوئی سانسوں کا دے رہا ہوں حساب
سُلگتی ریت کو رِم جھم ذرا نہ راس آئی

دیا جو تُو نے سبھی میں نے تجھ کو لوٹا یا
مجھے یہ دوستی گندم نما نہ راس آئی

بُجھا ہے دِل کا کنول عرصۂ بہار میں ہی
شگفتہ پھول کو بادِ صبا نہ راس آئی

اُداس شام کے سائے یہ پُوچھتے ہیں فرید
محبتوں کی تجھے کیوں ضیا نہ راس آئی

○
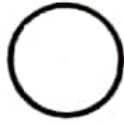
سینے پہ بوجھ، سانس رُکی، دل بھی کچھ ہے تنگ
اب کے تمام جسم میں برپا ہے ایک جنگ

اکثر دکھا رہا تھا مجھے آسماں کے خواب
آخر گیا ٹپک کے زمیں پر وہ بے درنگ

رنگوں کے اژدھام میں تحلیل ہو نہ جاؤں
حالات بدلے جاتے ہیں گرگٹ کی طرح رنگ

ایسے بھی حادثات وفا میں گزر گئے
پھولوں میں اُس نے بھیج دیئے جب لپٹ کے سنگ

ہر شہر ہر نگر مری منزل بنا گیا!
آزاد مجھ کو کر گیا جیسے کٹی پتنگ

گوہرؔ کہیں مراد کا کھو کر نہ لوٹنا!
ہر جوئے آب ہوتی نہیں خالی از نہنگ

شاید تری نِگاہ سے گِرنے لگا ہُوں مَیں
اپنے وجُود سے مجُھے آنے لگی ہے ننگ

اہلِ کرم کے طور سے بیگانہ مَت کہو !
دیکھے ہیں میں نے چشمِ مروّت کے سبھی رنگ

شاید ڈبو کے جائیں گی طغیانیاں فریدؔ
خالی نہیں فساد سے دل کی کوئی ترنگ

••
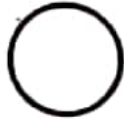
اسیرِ پنجۂ رنج و تعب میں رہتا ہوں
میں تجھ سے دُور بھی تیری طلب میں رہتا ہوں

بھلا رہا ہوں اُسے جس[۲] کو یاد رکھنا ہے
یہ کس بہانۂ غم بے سبب میں رہتا ہوں

میں تب سے اپنے لئے گھر نہیں بناتا ہوں
کھُلا یہ جب سے کہ دارالحرب میں رہتا ہوں

تمام دن وہ دعا دے رہے ہیں جینے کی
میں اپنے قتل پہ آمادہ شب میں رہتا ہوں

رہِ حیات میں زادِ سفر تیری یادیں
میں تجھ سے دُور سہی دُور کب میں رہتا ہوں

ہر ایک ظرف کے وہ احتساب میں ہیں فرید
یہ اور بات کہ اہلِ نسب میں رہتا ہوں

●●

فرصت جو مِلے خود سے ملاقات بھی ہو گی
دیوار کے سایوں سے نئی بات بھی ہو گی

پیاسا جو پلٹ آؤں وہ ہے اپنا مقدّر!
ملے مجھ سے یوں تو منزلِ ظلمات بھی ہو گی

ہاری ہوئی سرحد پہ ڈٹا اس لئے ہوں میں
جیتے ہوئے دشمن کی کبھی مات بھی ہو گی

قطعہ

اِس درجہ بڑھیں گے کبھی اِخلاص کے رِشتے
جو بات نہ کہنے کی ہے وہ بات بھی ہو گی

ناچے گا کبھی مور ترستے ہوئے دِل کا
اِک دِن تیرے الطاف کی برسات بھی ہو گی

●●
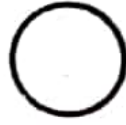
اُمیدوں کا سجا ہُوا محمل ہے زیرِ آب
مُدّت کی دوڑ دھوپ کا حاصل ہے زیرِ آب

اے چشمِ گریہ ناک یہ منظر بھی دیکھ لے
کشتی ہے سطحِ آب پر ساحل ہے زیرِ آب

پانی تمہاری یاد کا سر سے گزر گیا
اب تجھ کو بھی پکارنا مشکل ہے زیرِ آب

مچلی ہے موج موج تمنّائے دید کی
شاید اسی سبب سے مرا دِل ہے زیرِ آب

ٹھہروں اگر تو وسوسہ طغیانیوں کا ہے
اور لوٹنا بھی چاہوں تو منزل ہے زیرِ آب

○
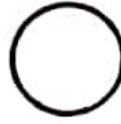
ہم فکرِ دل و جاں میں فغاں کر نہیں پاتے
وہ اَب کے گزرتی ہے بیاں کر نہیں پاتے

اس درجہ بڑھے نقل مکانی کے یہاں شغل!
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں پاتے

اِک موسمِ سفاک کی زد پر ہیں ہمیں کیوں؟
کیا اس لئے کہ مشقِ سناں کر نہیں پاتے

یہ کیا کہ شب و روز فقط اُن کی تمنّا؟
یہ کیا کہ محبّت کو عیاں کر نہیں پاتے؟

شاخوں سے لپٹتی ہے ابھی صرصرِ موہوم
بے برگ و نوا عزمِ جواں کر نہیں پاتے

اے خواہشِ دل نقش نہ کر آبِ رواں پر
نظارۂ اندوہ نشاں کر نہیں پاتے

●●

نذرِ سودا

دِل کو نہ صبر تجھ بِن نے جاں کو تاب تجھ بِن
سایوں میں گِر گیا ہوں اے آفتاب تجھ بِن

کاٹے ہیں روز و شب جو قُربت میں مَیں نے تیری
مانگے ہے زندگی اب اُنکا حِساب تجھ بِن

اِک برگِ خشک جیسا ہوں شاخ سے جُدا مَیں
پھرتا ہوں کو بکو اب ہر سو خراب تجھ بِن

کب تک رہوں میں یوں ہی لطف و کرم کے درپے
رکھتا نہیں ہے اِک پل یہ اِضطراب تجھ بِن

کاٹے سے روز و شب یہ کٹتے نہیں ہیں میرے
لگتی ہے زِندگانی مجھکو عذاب تجھ بِن

بھاتی نہیں ہے جی کو بادِ صبا کی شوخی
ویراں سا لگ رہا ہے شہرِ گلاب تجھ بِن

●●
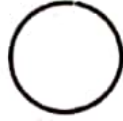
نیندوں کا قحط خواب کی ارزانی بڑھ گئی
تجھ سے بچھڑ کے اور پریشانی بڑھ گئی

جب سے چراغِ یاد بُجھا بادِ بے لحاظ
جینا محال ہوگیا ویرانی بڑھ گئی

چاہِ حیات پر جو سکندر پہنچ گیا
خستہ تنوں کو دیکھکے حیرانی بڑھ گئی

شاہِ زمن کو دستِ ہنر ور ہُوا سُپرد
آدابِ آبِ زر سے تن آسانی بڑھ گئی

ہر کاغذی بدن کو ہے دعوئِ رنگ و بُو
ذوقِ ریا میں طرزِ گل افشانی بڑھ گئی

اُس مضطرب مزاج سے حصّہ طلب کرو
ہنگامۂ حیات کی یکسانی بڑھ گئی

جب سے یہاں یہ رسمِ لباسوں کی چل پڑی!
تب سے وہاں پہ خواہشِ عریانی بڑھ گئی

کب داد کا طلب ہے تیرا اِک سخن فریدؔ؟
حد سے صریرِ خامۂ لافانی بڑھ گئی

○

یاد کے پر کتر کے دیکھا ہے
کام یہ مَیں نے کر کے دیکھا ہے

تیرا مِلنا نہیں ہے کارِ سہل
جی کے دیکھا ہے مَر کے دیکھا ہے

میں کہ خود اپنی ہی تلاش میں ہوں
حد سے آگے گزر کے دیکھا ہے

○

اُجاڑ بستی نگر ہے ویراں
مکین برباد گھر ہے ویراں

اُداس شام اور سحر ہے ویراں
بہت دِلوں سے سفر ہے ویراں

یہ اُن دیاروں سے پوچھ لینا
جہاں پہ ایک اک بشر ہے ویراں

لباس ہے سلوٹوں سے عاری
دِلوں کے تیور مگر ہے ویراں

شبہِ خواب و خیال کی ہے
اُداس چہرہ نظر ہے ویراں

خوشی سے محروم ساعتوں میں
یہ زندگی کس قدر ہے ویراں

فریدؔ خوابوں کے قافلے کا
یہ کس لئے ہر پہر ہے ویراں

●●

○
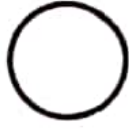
رہِ تمنا قدم قدم رہ گزارِ بے سنگ میل نکلا
قلیل سمجھا میں جس سفر کو وہی بالآخر طویل نکلا

غبارِ وحشت اسی ڈگر پر جنوں کو بے دست و پا نہ کر دے
غمِ جہاں سے غمِ وفا تک جہاں پہ ہر پل عجیل نکلا

وہ اک سخن اعتبارِ صبر و شکیب جس کو کہا گیا تھا
وہ اک سخن کیوں دُکھا کے دل کو فروغِ متنِ دلیل نکلا

عتابِ نمرود بے ثمر ہے یہ معجزہ کم نہیں ہے یارو
میں عصرِ حاضر کی آگ و آہن سے بچ کے مثلِ خلیل نکلا

حصولِ مرہم میں حد سے گزرا مآل دیکھا یہ عجلتوں کا
نمک سے بھرنے تمام زخموں کو پھر سے دستِ جمیل نکلا

تمہاری یادوں کا سلسلہ ہو کہ قرب کی بے مہار ناقہ
رفاقتوں کا ہر ایک مرکب سبک قدم و بے نکیل نکلا

وہ ایک لمحہ جو اہلِ دل کو سکھا گیا بے کرانیاں ہیں
وہ ایک لمحہ ہی شہرِ جاناں سے کر کے آخر ذلیل نکلا

مآلِ وحشت اگر یہی ہے تو پھر یہ کیا ہے فرید صاحب!
ہر اک رشتہ رہِ تمنا میں خونِ دل کا کفیل نکلا

کتابِ صبر میں لکھا ہوا حرفِ اعادہ ہوں
جہاں پر تم نے چھوڑا تھا وہیں پر ایستادہ ہوں
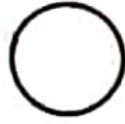
سر پہ رنج و تعب نہیں آتے
سوچتا ہوں میں کب نہیں آتے؟

مُدتوں جی لئے مگر اب تک
زندہ رہنے کے ڈھب نہیں آتے

ٹھن گئی جنگ کے حریفوں میں
اَمن کے روز و شب نہیں آتے

جنکو کہنا تھا روبرو اُنکے!
وہ سخن تا بلب نہیں آتے

توڑنے دامنِ تہی کا بھرم
تیری محفل میں سب نہیں آتے

بات کوئی ضرور ہوگی فرید
یاد وہ بے سبب نہیں آتے

O

آنکھ کو حیران لکھوں
شہر کو ناپُرسان لکھوں

خوؐد سے بھی بیگانہ ہوں
تجھکو کیا جانان لکھوں

رات کے اِس اَندھیارے میں
ملنے کے سامان لکھوں

اپنے آپ سے لڑتا جا
جینا نہیں آسان لکھوں

جسکی ہوئی تاکید بہت
کیوں نہ وہی پیماں لکھوں

غَم کی بھیگی راتوں میں
دَرد کا ہر عنواں لکھوں

آنگن آنگن گھومتا جا
کاغذ کے گلدان لکھوں

قریہ قریہ خاک اُڑی
اپنا کیا ارمان لکھوں

مست الست تو ہے فریدؔ
تجھ کو کیا انسان لکھوں

○
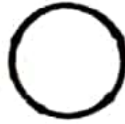
آئینہ دار ہواؤں کا حوالا بھی گیا
کٹ گئی شاخ تو پھل مانگنے والا بھی گیا

••

○
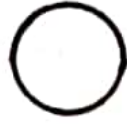
تکلّفات کا لبادہ اُتار کر آیا
برنگِ بوئے سمن خُود کو ہار کر آیا

تجھے یقین نہیں ہے، تو اپنے آپ سے پوچھ
بچا کے لایا جِسے مَیں، وہ وار کر آیا

وہ حق پرست نہ تھا عاقبت کا سودائی
ہَوائے دہر پہ مجھ کو سوار کر آیا

ملا بھی کیا اُسے جُز یاس درد و ناکامی!
گلی گلی میں تجھے جو پُکار کر آیا

کبھی یہ پوچھنا فرصت میں موجِ طوفاں سے
وہ کِسطرح سے سمندر کو پار کر آیا

وہ گرد گرد صداؤں کے آسرے پہ فریدؔ
زیاں رسیدہ بگولے شُمار کر آیا

●●

عہدِ جنوں کے روز و شب یوں بھی کبھی گزارنا
مارے تجھے جو سنگ کوئی تو بھی اس پہ مارنا

راہِ طلب میں گر کہیں درد کی اک کرن ملے
پلکوں کی رہ گزار سے دل میں اُسے اُتارنا

محوِ سخن کہ خود سے رہ اور یقینِ صبح رکھ
زُلفِ شبِ فراق کو یوں بھی کبھی سنوارنا

نیند کے قافلے چلو ڈھونڈلیں پھر نگر نگر
خوابوں کے عکس عکس کو جاگتے میں پکارنا

چاہے اگر یہ دل ترا پھول نئے ہوں باغ میں
پچھلی رُتوں کے قرض تم پہلے سبھی اُتارنا

جب حدِ ادراک پھاندوں بے کراں کہنا مجھے
خالی از اندیشۂ سود و زیاں کہنا مجھے

ایک سے لگنے لگے ہیں دل کو سارے ہی دیار
نکہتِ گل کی طرح اب لامکاں کہنا مجھے

سوکھی دھرتی کی زباں پر رکھ کے حرفِ العطش
کس طرف جانا ہے اے ابرِ رواں کہنا مجھے

مت سمجھ میری شفقت کو میری مجبوریاں
بھا گیا کب تیرے منہ سے داستاں کہنا مجھے

سایہ سایہ جمع کرنا روز کا معمول ہے
وحشتوں کے شہر کا اک ترجماں کہنا مجھے

جب حصارِ رنگ سے نکلوں میں آگے اے فریدؔ
چاہتوں کے لفظ و معنیٰ کا بیاں کہنا مجھے

O
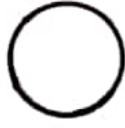
دُہرا رہے ہو گزرے ہُوئے واقعات پھر
غارت کرو نہ میرا سکُونِ حیات پھر

اے وقت آ کے پونچھ لے اشکِ رواں کی دھار
مجھکو رُلا رہے ہیں وہی حادثات پھر

ریگِ ہوس سے بھرتا ہُوں دامن اُمید کا
ڈھلنے سے رہ گئی ہے تمنّا کی رات پھر

کیا پھر سے زندگی کو ہے مجھ سے کوئی گلہ؟
تاریک کیوں نظر میں ہوئی کائنات پھر

اِس بار مل کے اُس سے میں حیران پھر ہوا
اِس بار دے گیا وہ غمِ بے ثبات پھر

●●

ہر راہ میں لُٹایا سامان زندگی کا
نِکلا نہ کوئی اب تک ارمان زِندگی کا

وہ ریت کے گھروندے اب ڈھونڈوں کہاں پر
ڈھا کر چلا ہے جِنکو طوفان زِندگی کا

آخر اُسے بھی پایا ہارے ہوؤں میں مَیں نے
جیتا ہوا تھا جِس نے میدان زِندگی کا

مجھکو دُعا یہ دے کر وہ فقیر جا چکا ہے
"آسان نہ چھوٹنا ہو دامان زِندگی کا"

اِک راہ زن کو مَیں نے جب ہم سَفر بَنایا
تب ہو گیا سَفر کچھ آسان زِندگی کا

کم ظرف محسنوں نے کہلا یہ مجھکو بھیجا
ہر معرکہ ہے اَب کے گُھمسان زِندگی کا

• ــــــ نظمیں

دُعا

میں گھر سے جب بھی نِکلتا تھا
میرا بستہ میرے کاندھے پر
آویزاں ہوتا تھا اُسطرح
جالے میں لکڑی ہو جسطرح
میری ماں مجھے جاتے جاتے
اکثر اِس حرفِ تر سے نوازتی تھی
"جا بیٹا تجھے علم کے زیور عطا
ہوں۔"
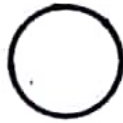
آتے جاتے موسموں نے میرے ماتھے پر
تیس برس کا عُنوان
ثبت کیا اور کر رہا ہے
بیج سے انکھوا پھوٹا
انکھوا شاخدار قصّہ سُنانے لگا ہے
اور اب میں خود اپنے لئے
علم کے زیور مانگتا ہوں

اسپانِ مَن گُم شُدند

رواروی کے سلسلے نہ فکرِ خیر و ذکرِ غم
رواروی میں کون کس کو پُوچھ لے
رواروی میں کون کِس کا بوجھ لے
میں اِک اکیلا آدمی میرے حریف چارسو
میں اِک اکیلا آدمی میرے حلیف
"فقط اُنہیں پڑی ہوئی کہ لوٹ لیں
فتح گاہ سے شکستہ خورِ غنیم کا
مال و منال یہی ہے سب کی جُستجُو
میں اِک اکیلا آدمی حریفوں اور حلیفوں
کے درمیاں گرا پڑا مثالِ تیر گھرا ہُوا
تماشہ دیکھکر خُود کو کوستا
خُود کو حوصلہ دینے میں منہمک
میں اِک اکیلا آدمی
خود پہ طعنہ زن بھی ہُوں
میں اِک اکیلا آدمی نہ ذِکرِ غم نہ فکرِ آبرو مجھے

میرے رقیب چارسو

میں اِک اکیلا آدمی کسی کا ساتھ دینے سے قاصر

کہ میرے گھوڑے گم ہوئے

میں اِک اکیلا آدمی میرے حریف چارسو

میں اِک اکیلا آدمی میرے حلیف چارسو

••

۲۷، جنوری ۱۹۹۱ء

ہَوا کے دوش پہ دِل کا دِیا جَلانا پڑا
جنوُں کے کام کو کر کے مجھے دِکھانا پڑا

اُداسیوں کے اِختتام پر

میں سوچتا ہوں بے کسی کے نام پر
ہر ایک معرکہ کے اِختتام پر

ترے تمام فیصلے ترے تمام مشورے
تری حماقتیں یترے تمام معرکے

یہ تلخ گھونٹ جام کیسے بن گئے
بلندیوں کے خواب کیسے چھِن گئے

ہر ایک احتجاج نقش آب کی طرح
ہر ایک اعتمادِ عکسِ خواب کی طرح

یہ کیا مری نظر میں مجھکو خوار کردیا مجھے
بس ایک حرفِ حق نے بے وقار کردیا مجھے

یہ سوچتا ہوں بے کسی کے نام پر
ہر ایک معرکہ کے اِختتام پر

●●

ایک نظم

اپنے والد کے نام

اے دنیا کی خیر کے طالب
اپنے لئے بھی خیر طلب کر
تیرے گھر کے بام و در کو
اہلِ قریہ چاٹ رہے ہیں
ثمرِ رقابت بانٹ رہے ہیں
تیرے بازو کاٹ رہے ہیں
اے دُنیا کی خیر کے طالب
اپنے لئے بھی خیر طلب کر

ایک نظم

یاد کے اُلجھے ہُوئے دھاگے سے
کوئی سِرا نہ ہاتھ آتا ہے
گاہ بُنتا ہُوں گیت وَصلت کے
گاہ فرقت کی مار کھاتا ہُوں

سَر دشَب کے اُداس بِستر پَر
گامزن ہے غموُں کا اِک لشکر
مار لیتا ہُوں میں کبھی میدان
یہ کبھی کاٹتے ہیں میرا سَر

تیری یادُوں کے سِلسلے ہیں دَراز
مجتمع ہو گئے نشیب و فَراز!

حکایتِ حرف گر

گئے دِنوں کی لاش کو اُٹھا کے بُوڑھا گورکن
عَرق عَرق ہے، جسم سَب جبیں بھی ہے شِکن شِکن
یہ مَرحلہ وہی ہے سِکھائے راکھ مَلنے کے ہُنر
یہ مَرحلہ بھی دِل شِکن ہے پیرہن بھی تَر بتَر

نہ بے کراں ہُوا کبھی یہ زندگی کا کارواں
نہ بے اُفق ہُوا کبھی اُداسیوں کا آسماں
مَیں زِندگی کے کولھو میں بیل سَا کسا ہُوا
مَیں ایک جَبر ہُوں، ہے میری زندگی بھی جَبر
جو اپنے آپ سے مِلوں تو ہوتی ہے مجھے گھٹن

اُسے اگر مِلوں کبھی تو بول دُوں گا حال سَب
کہ کاٹنے سے کٹ سکے ہیں کب یہ میرے روز و شب
بدل گئی یہ زِندگی بَدل گئے وَفا کے ڈھب
مجبتیں نہ نفرتیں نہ دوریاں نہ قربتیں
کہاں گئے وہ رات دِن کِدھر گئیں وہ فرصتیں

میرے قریب رہ کے بھی میرے قریب وہ نہیں
میرے رفیق وہ نہیں میرے حبیب وہ نہیں
ذرا ذرا سی اُلجھنیں ذرا ذرا سی آڑچنیں
یہ اِک وتیرہ پڑ نہیں گھیے چناں گھیے مُجنیں
اُداسیوں کے بوجھ کے تلے دَبا دلِ حزیں

گئے دِنوں کی لاش کو اُٹھا کے بُوڑھا گورکن
عرق عرق ہے جسم سب جبیں بھی ہے شِکن شِکن

●●

متفرقات

بے برگ دلوا ہوں اُسے اِتنا تو پتا ہے
پھر بھی مجھے گلشن کے لئے خطرہ لکھا ہے
آسیب زدہ شہر کی وہ اُجڑی سرا ہوں
مدّت سے جہاں کوئی نہ آیا نہ گیا ہے

وقت کے ساتھ چلتا ہوں
پاؤں کی بیڑیاں بدلتا ہوں

چلو کہ خود کو بدلنے کا تجربہ کرلیں
جو آج تک نہ کیا ہے وہ حادثہ کرلیں

اپنے اطراف و جوانب سے یہ غافل ٹھہرے
اب اِسی دھن میں ہوں صبر آئے میرا دِل ٹھہرے

تیرے آنگن میں پھول کھِل آئے
میرے جیسا تو بد نصیب نہیں

شکوۂ جور ستم گر سے کیا کرتا ہوں
دِل کے سمجھنے کا ہواؤں سے گلہ کرتا ہوں

ہر احباب سے کترا کے گزر جانا ہے
اب تو گھر چھوڑ کے بے زادِ سفر جانا ہے

شل حوصلے ہیں دِل کے زخمی ہے ہاتھ پاؤں
ارمان کا لبادہ کانٹوں میں پھنس گیا ہے

بس تجھے ہی رات دِن دیکھا کروں
اپنے بارے میں بھی کم سوچا کروں

کیسا یہ وہم دِل کا دامن پکڑ کے بیٹھا؟
کیسا یہ غم شکنجوں میں مجھکو کس رہا ہے؟

خواہش کے باوجود میں پل بھر نہ سو سکوں
آنکھوں کے تار میں کوئی موتی پرو سکوں

ہر بار میرے صبر کا مت لے تو امتحان
اُتنا نہ بوجھ ڈال جسے میں نہ ڈھو سکوں

گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا مجھ سا دُکھی ہے شہر میں کون
چھت پر چڑھ کر میں نے دیکھا لگی ہوئی ہے گھر گھر آگ

بوئے گُل کی طرح کہیں نہ ٹھہر
رشتہ ہر اِک سے موسمی رکھ لے

رہنِ اندوہ یاس پیہم ہُوں
مُجھ سے کم کم ہی دوستی رکھ لے

میں کِسی دیس کا نہیں بابا
مجھ سے پہچان عارضی رکھ لے

سایہ قد سے طویل تر ہے یہاں!
دھوپ سے کون آشتی رکھ لے

●●

اَبرِ تَر

کچھ ترحم چاہیئے اے اَبرِ تَر
جل گئیں میرے وطن کی کھیتیاں

— فرید پوہتی

• ——— غزلیں

رہ شکستہ، فاصلے، دشت و سراب
سلسلے ہیں زیست کے، دشت و سراب

کچھ نہیں میرے لئے جز تشنگی!
میری قسمت میں لکھے دشت و سراب

اس جگہ مجھ کو اڑا لائی ہوا
ہیں جہاں کے آسرے دشت و سراب

کیوں نہ قیمت خود شناسی کی بڑھے
آئینے بننے لگے دشت و سراب

جانے کس کے گھر مجھے لے جائیں اب
بے نوائی رت جگے دشت و سراب

کسی پہ کرنا نہیں اعتبار میری طرح
لٹا کے بیٹھو گے صبر و قرار میری طرح

سمندروں سے بھی لوٹے جو تشنگی لے کر
سمیٹتے ہیں وہ اب تک پھوار میری طرح

ابھی تو ہوتی ہیں سرگوشیاں پسِ دیوار
ابھی نہ کرنا ستارے شمار میری طرح

بگولہ بن کے اڑا خواہشوں کے صحرا میں
ٹھہر گیا تو فقط تھا غبار میری طرح

انہیں کے سایوں میں اب سر جھکا کے چلتا ہے
اگا گیا تھا جو سرو و چنار میری طرح

○

خستہ جاں پابندِ کارِ رائگاں ہونے کو ہے
جمع خار و خس برائے آشیاں ہونے کو ہے

زندگی کی حیرتوں میں پھر اضافہ ہو گیا
تھی جو ہونے کی توقّع وہ کہاں ہونے کو ہے

سونپ کر جسکو چلا تھا میں نگہہ داری کا کام
وہ بھی محوِ سازشِ تیر و سناں ہونے کو ہے

واپسی کے راستے بھی ہو گئے مسدود سب!
اور مرے جی کو بھی احساسِ زیاں ہونے کو ہے

ساحلوں سے باندھ اپنی کشتیاں تو بھی فریدؔ
پھر سے برگشتہ ہوائے بادباں ہونے کو ہے

●●

پُرکیف ساعتوں کے حسین خواب لے گیا
صبر و شکیب نیند کے اسباب لے گیا

یہ حادثہ بھی ہوگا چمن میں یقیں نہ تھا
پھولوں کا رنگ اوس کا سیلاب لے گیا

اُس رہ گزر میں کس نے دیا ہے کسی کا ساتھ
جس سمت مجھکو یہ دِل بے تاب لے گیا

وہ قہقہوں سے بنھاتا ہے رسم زندہ دِلی
ہر ایک شخص کو وہ خوش نصیب لگتا ہے

○
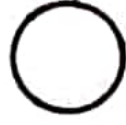
خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اک دُکاں پر

کرایے دار سے ہوشیار رہنا!
کہیں قابض نہ ہو جائے مکاں پر

تہِ دیوار سائے مر گئے کیوں؟
بہت حیران ہوں اِس داستاں پر

ہوا تو لے اُڑی برگ و شجر تک
یہ کیسا وقت آیا گلستاں پر

وہ اُسکی خواہشِ تسخیر اللہ!
کمندیں ڈالتا تھا کہکشاں پر
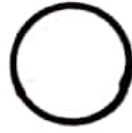
اُس بے وفا سے اب کے محبت نہیں رہی
وہ دِل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

ویرانیِ حیات کا یہ کیا مقام ہے!
لگتا ہے مجھکو تیری ضرورت نہیں رہی

آگے کی راہ گھیر لی سرکش ہواؤں نے
واپس بھی لوٹ جانے کی صورت نہیں رہی

رکھتا ہوں اب تو خود سے حریفانہ کشمکش
اپنوں سے کوئی وجہِ کدورت نہیں رہی

وحشت نے آلیا ہے در و بام کو فرید
کس سے کہوں کہ گھر کی وہ حالت نہیں رہی

○
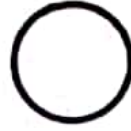
آندھی چلی درخت سبھی اوندھے مُنہ گرے
سایوں کی جستجو میں مگر اِک نقیر تھا

شاید بغیر سیج وہ سویا تھا رات بھر
اُسکے تمام جسم پر نقشِ حصیر تھا

نِکلا تھا گھر سے ڈھونڈنے وہ اپنے آپ کو
شاید یہی گُناہِ کبیر تھا

○

صحرائے خشت و سنگ میں آواز کس کو دُوں
شہرِ سکوں میں بڑھنے لگا اِضطراب سا

○
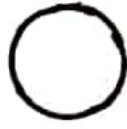
قلب و نظر کا مسئلہ یوں حل طلب بھی ہے
اے دل تری تباہی کچھ اپنا سبب بھی ہے

واپس نہ آسکو گے جو گھر سے نکل پڑے
راہیں شکستہ ہی نہیں تاریک شب بھی ہے

ہر شب جلائے رکھتا ہوں دہلیز پہ چراغ
شاید کہ لوٹ آؤ گے اُمید اب بھی ہے

○

اِک دیا ہوں تیرے کام آؤں گا رستے میں ضرور
تیز آندھی میں سب مجھے رکھ تہ داماں پنہاں

○

اُن کے سر ہیں اور سنگِ کو دکاں
دیکھ لے اب حالتِ شوریدہ گاں

آؤ کھیلیں ہم سبھی مِل کر دھمال!
مر گئی ہے آج دیوانوں کی ماں

کچھ ترحم چاہیئے اے ابرِ تر
جل گئیں میرے وطن کی کھیتیاں

خود کو بھی بھولا ہوں اب کی بار میں
تجھ کو بھی اب یاد آؤں گا کہاں

یہ نہیں پہچان سکتا ہوں میں اب
تھا کہاں پر شہر میں میرا مکاں

جو اُٹھا لایا ہُوں کوئے یار سے
سَر پہ ہے اب تک وہی بارِ گراں

بچ نکلنے کا کوئی اِمکاں نہیں
چاروں جانب ہے حصارِ دشمناں

ہُوں اَسیرِ دامِ اُلفت اے فریدؔ
من نمی دانم فلاں ابنِ فلاں

○

گھٹتے بڑھتے منظروں کے درمیاں رکھ کر گیا
دست و پا شل تا نظر آسانیاں رکھ کر گیا

●●

بطرزِ خاص ستم جو جنا جنا سا لگا
اُسی سے درد کا رِشتہ سجا سجا سا لگا

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے
یہ کاروبار پُرانا نیا نیا سا لگا

اُلجھ گئے ہیں پرندوں کے شاخ شاخ سے پَر
نئی فضاؤں کا لہجہ سزا سزا سا لگا

وہ نقشِ لوحِ وفا پھر بھی جاوداں نہ ہُوا
اگرچہ حرفِ جُدائی مٹا مٹا سا لگا

فضول درد چھپانے کی کوششیں تھیں فرید
زبانِ حال سے سب کچھ کہا کہا سا لگا

بوئے گُل محوِ بے کرانی ہے
رنگ گُلشن کا داستانی ہے

بارشِ سنگ وادیوں پہ ہوئی
فصل پر قہر ناگہانی ہے

اُس جگہ تُم نے مجُھکو چھوڑ دیا
جِس جگہ سبزہ ہے نہ پانی ہے

اب سلامت مکان ہے نہ مکیں
کیا یہی تیری پاسبانی ہے

جانے کِس سمت لے چلے گی مجُھے
اِک ہوا ساتھ بادبانی ہے

اب تو کم کم ہی بولتے ہو فرید
جانے کیا تم نے دِل میں ٹھانی ہے

••
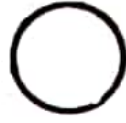
بنے بنائے سے رستوں کو ڈھا گئی ہے ہَوا
تمام نقشِ کفِ پا مِٹا گئی ہے ہَوا

کہیں پہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا
نجانے کہاں مجھ کو آ گئی ہے ہَوا

کہاں پہ لوٹ گیا ہوں مجھے یہ فکر نہیں
مَیں سوچتا ہوں کہاں سے گرا گئی ہے ہَوا

کہاں سے مانگ کے لاؤں ضیائیں گھر کیلئے
سبھی گھروں کے دیئے تو بجھا گئی ہے ہَوا

خیال و خواب کے تتلی پروں کو روتے ہیں
اداس صحن میں فتنہ جگا گئی ہے ہَوا

تعلقات کشیدہ وہ جوڑنے نکلا
اُسی نگر میں مجھے لا کے چھوڑنے نکلا

بطورِ تحفہ ملی سیج زرد پتوں کی
لہو جو اپنا گلستان میں چھوڑنے نکلا

جنوں کا جسکو سہارا بفیضِ عشق ملا
کلائیاں وہ خرد کی مروڑنے نکلا

حصارِ وقت نے خود اُسکو گھیر رکھا ہے
میں کس سے رشتۂ اخلاص جوڑنے نکلا

یہ کیا کہ فتنہ کوئی راستوں میں ساتھ لئے؛
تمام شہر کو پاگل جھنجھوڑنے نکلا

جو بے گناہ پرندوں کو قید کرتا تھا
قفس وہ آج سرِ راہ توڑنے نکلا

○

تیز آندھی میں چراغوں کو جلایا میں نے
اپنی نادانی پہ دُنیا کو ہنسایا میں نے

ماہ و انجم کے شبستان نے اُسے موہ لیا
جسکی آمد کے لئے گھر کو سجایا میں نے

نخلِ دِل اُگ نہ سکا یوں کہ زمین تھی بنجر
اَبرِ تر کیوں! تجھے اِلزام لگایا میں نے

○

برستا تو سارا شہر بہا کر ہی تھم گیا
چھایا جو آسماں پہ تھا ٹکڑا سحاب کا
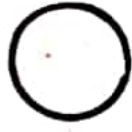
سانس لینا عذاب ہے بابا
لمحہ لمحہ خراب ہے بابا

پھر وہی مرحلہ ہے پیشِ نظر
پھر وہی اضطراب ہے بابا

وہ کریدے ہے راکھ چولھے کی
اور نگاہوں میں خواب ہے بابا

میں کہ مثلِ غبار صحرا ہوں
تو سراسر سحاب ہے بابا

وہ جو دھونی رمائے بیٹھا ہے
کوئی پوچھے جواب ہے بابا

○
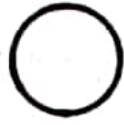
صعوبتِ شبِ غم سے بہت نڈھال ہوئی
ترے بغیر مری زندگی محال ہوئی

جہاں قریب سبھی کچھ ہے فرصتوں کے سوا
اسی مقام پہ اب تو شریکِ حال ہوئی

ابھی تلک ہے سرِ رہ گزار خاک بسر
وہ آرزو جو کشاکش میں پائمال ہوئی

مثالِ موجِ بلایاں چلے ہے موجِ جنوں
تری گلی بھی زمانے میں بے مثال ہوئی

خوشی کی ایک رمق وہ جو دل میں باقی تھی
ہزار غم کے مقابل میں بڑھ کے ڈھال ہوئی

ایک احساسِ ضَرَر مجھ کو دیا
خودُ سے لڑنے کا ہُنر مجھ کو دیا

پھُول، سبزہ، شاخ سب اُس نے لئے
اِک نہالِ بے ثمر مجھ کو دیا

باغ کی رونق ہوُئی جس سے ہَوا
وہ فسادِ خشک و تر مجھ کو دیا

پست ہمت، بے بصر اور سُست گام
دیکھو کیسا راہبر مجھ کو دیا

ماحصل سے بے یقیں کر کے فرید
مرحلوں کا دردِ سر مجھ کو دیا

لہو لہان تمنّاؤں کا چمن ہے ابھی
تمہاری یاد کے پہلو میں بانکپن ہے ابھی

نجانے کون سا الزام لوگ دیں گے اب
نظر نظر میں تقاضوں بھری چبھن ہے ابھی

تلاش کرتا ہوں میں خود کو گھر کے گوشوں میں
تمام جسم میں بے نام سی تھکن ہے ابھی

کدھر کو جائے گی دم لینے جنگلوں کی ہوا
چہار سمت درختوں سے اک گھٹن ہے ابھی

بدن کے داغ فریدؔ اب چھپیں تو کیسے چھپیں
کہ تار تار سبھی میرا پیرہن ہے ابھی

○
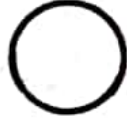
رنج کی بات کر رہے ہیں لوگ
حد سے آگے گزر رہے ہیں لوگ

کھوج میں موتیوں کی نکلے تھے
خاک دامن میں بھر رہے ہیں لوگ

چھوڑ جاتے ہیں دل میں گہرا غار
چھب دکھا کے گزر رہے ہیں لوگ

سبز صحرا میں منتظر رکھکر
وعدہ کر کے مکر رہے ہیں لوگ

جانے ہو کر کہاں سے آیا دن
اپنے سائے سے ڈر رہے ہیں لوگ

اِک مُعمّے کی ہوئی نشو و نُما پانی پر
کر گیا ہوں میں رَقم حرفِ وَفا پانی پر

یہ تو گاؤں ہے یہاں کے ہیں عجب رسم و رواج
لڑتی رہتی ہے سَدا خلقِ خُدا پانی پر

میری تڑپ پیاس بجھے گی تو اِک کیا جائے گا
والیِ آب نہ یوں دِل کو دکھا پانی پر

بارہا آگ پلائی گئی پھولوں کو یہاں!
بارہا کاٹے گئے دَستِ صَبا پانی پر

یاد کے گہرے سمندر میں نہ ڈالو پتھر
دائرے کھینچتی ہے موجِ ہوا پانی پر

تیرنے والے کہاں دیکھتے ہیں موجوں کو
فیصلہ چھوڑتے ہیں اچھا بُرا پانی پر

کاغذی ناؤ یہ کیا پار اُتارے گی فرید
خود کو نادان تھا تماشا نہ بنا پانی پر

●●

داؤ عدو نے وہ مارے گئے ہیں
جیتی بازی ہار گئے ہیں

میرا سفینہ بیچ بھنور میں
تیرنے والے پار گئے ہیں

کُند تھے اپنے تیغ و تبر ہی
خالی سارے وار گئے ہیں

طالبِ آب ہوئے تھے پیاسے
تیر دہن پر مارے گئے ہیں
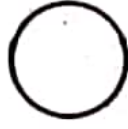
وہ رہ گزارِ تمنّا سے چوٹ کھا کے گیا
سکوتِ دشت میں اِک شور و غل مچا کے گیا

زمیں پہ چاند ستارے بکھیرنے والا!
نجانے کیوں مرے گھر کا دِیا بجھا کے گیا

شریر بچّوں نے نوچے تھے تتلیوں کے پَر
اسی سے ملتی کہانی کوئی سُنا کے گیا

اُداسیوں کے پرندے منڈیر پر رکھ کر
خموشیوں کے شجر صحن میں اُگا کے گیا

گزر کے ابر کی صورت وہ بستیوں سے فریدؔ
نظر نظر میں عجب تشنگی بسا کے گیا

بیتاب، بیقرار، مزاجاً کرخت تھا
شاید مرا رفیق بھی اِک تیرہ بخت تھا

تیار تھا نہ کوئی بھی ہونے کو ہمسفر
باندھے ہوئے اگرچہ سفر کا وہ رخت تھا

کرتا نہ کیوں میں دعوتِ مژگاں کا اہتمام
دِل خون خون تھا تو جگر لخت لخت تھا

تازہ ہوا سے رشتۂ موسم تو تھا ضرور
بے برگ و بارِ دِل کا مگر ہر درخت تھا

بھرتا وہ کسطرح مرا کشکول مہرباں!
اُسکو ہے یہ خبر میں سرِ تاج و تخت تھا

کیا بات ہے فرید تجھے چپ ہے کیوں لگی؟
لوگوں میں نامور تو میاں جانِ سخت تھا

●●

سُلگ رہا ہوں اسی تجسس میں چاہنے کے اصول کیا تھے
تمہارے بالوں میں کل بتاؤ گلاب کے سرخ پھول کیا تھے

تھکا تھکا ایک اک مسافر کہاں کی منزل کدھر کے راہی
بچھڑ کے خود سے اگر ملے ہیں تو پھر یہ اتنے ملول کیا تھے

یہ حال ہے دل گرفتگی کا کوئی ہے غمگیں کوئی فسردہ
اُتر گیا ہے دماغ و دل سے مسافتوں کے اصول کیا تھے

کبھی متاعِ چمن وہی تھے کبھی تھے سامانِ صد بہاراں
نئی فضا نے کئے ہیں بے پر پرندے ورنہ فضول کیا تھے

●●
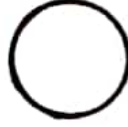
سانس رُکے ہے جی چلے ہے حال ہمارا اب کیا ہوگا
دِل کی باتیں کون سُنے ہیں بوجھ یہ کیسے ہلکا ہوگا

ہم سے بے زر لوگ کہاں ہیں وہ تو دھنی کہلاتے ہیں
مال ومتاع کے لُٹ جانے کا جنکو یارو خدشہ ہوگا

جیون اُجڑا، راتیں اُجڑیں، دِن بھی سونے سونے ہیں
روگ لگا ہے جی کو ایسا جو نہ کبھی بھی اچھا ہوگا

ڈھونڈ رہا تھا اُنکو شاید گھر کے اُجڑے گوشوں میں
سود وزیاں کا زینہ چڑھتے جن لمحوں کو کھویا ہوگا

گھر میں اُتنے فِتنے جگے تھے خود کو یاد نہ آیا ہُوں
میرے بارے اب کے ساون تم نے کیا کیا سوچا ہوگا

کچھ بھی نہیں ہے جز نقالی بات بنے گی کیسے فریدؔ
کاری چوٹ لگے جب دِل پر میرؔ کا جیسا لہجہ ہوگا

○
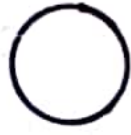
شکستہ پیکروں میں رنگ بھرنا آگیا ہوگا
ہوا کے ایک جھونکے سے بکھرنا آگیا ہوگا

سُنا ہے ہر تقاضا نو بہ نو سانچہ بدلتا ہے
جو کرنے کی نہ تھی خواہش وہ کرنا آگیا ہوگا

ہنر سب زیست کرنے کے وہ یکسر بھول بیٹھا ہے
نہ جینا آگیا ہوگا نہ مرنا آگیا ہوگا

بڑا چالاک ہے وہ شخص ہر گُر جانتا ہے وہ
بھرے چوپال پر اُسکو مکرنا آگیا ہوگا

سُنا تھا میں نے وہ پانی پہ چل کر پار اُترے گا
سفینے ڈوبتے دیکھے ہیں ڈرنا آگیا ہوگا

●●
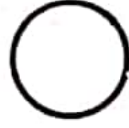
گم گشتگی پہ مائلِ فریاد بھی نہیں
کِن راستوں سے آیا یہاں یاد بھی نہیں

واضح معاملات ہوں شب خوں کے کِس طرح
کوئی نشان ریت پہ آباد بھی نہیں

جلتے نگر کا سب نے تماشا کیا مگر
میرے سوا کِسی کو وہ دِن یاد بھی نہیں

دِن زندگی کے ایسے گزرتے ہیں اے فریدؔ
دِل شاد گھر نہیں ہے تو ناشاد بھی نہیں

فتنۂ ماہ و سال ہے شاید
شہرِ دل پائمال ہے شاید

عمر گذری ہے جس کو سلجھاتے
دل کا اُلجھا سوال ہے شاید

قریہ در قریہ ڈھونڈتا ہوں جسے
گم شدہ اک خیال ہے شاید

مجھ سے ملنے یہ کون آیا ہے؟
لمحۂ لازوال ہے شاید

گھر کا دروازہ جب سے بند ہوا
کسی مکڑی کا جال ہے شاید
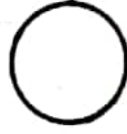
آشنائی کا صلہ عیّار سے کیا مانگتا
سائباں ٹوٹی ہوئی دیوار سے کیا مانگتا

ٹولیاں وہ پنچھیوں کی رنگ رنگ اور پُرکشش
اُڑ گئیں کس سمت وہ اشجار سے کیا مانگتا

چند مہمل لفظ تھے کس سے وہ ہوتا ہمکلام
گونگا شہری پھر لبِ اظہار سے کیا مانگتا

دھوپ اُتری بام و در سے راستے سونے لگے
کیا ہوا انجامِ سفر رفتار سے کیا مانگتا

کیوں بلندی کے تصوّر کو نہ چھوڑ آتا فریدؔ
واقفِ معیار تھا کردار سے کیا مانگتا

نذرِ حامدی کاشمیری

نکلا ہوں کس تلاش میں اب کے کہ دوستو
پُر خار راستہ ہے ہراساں شجر شجر

اک وقت ہم نوا تھے خس و خار بھی مرے
اک وقت یہ کہ مجھ سے گریزاں شجر شجر

ممکن کہاں کہ شاخ پہ باقی ثمر رہے
ہے سر پھری ہواؤں میں رقصاں شجر شجر

اب کس سہارے پر یہ سفر طے کروں گا میں
پُر ہول دشت اور ہے پنہاں شجر شجر

●●

بوجھل ہے آنکھ نیند سے گھر سوچنے لگے
شب کس جگہ کہاں ہو بسر سوچنے لگے

اس آرزو میں روتے ہوئے عمر کٹ گئی
کب معتبر ہو دیدۂ تر سوچنے لگے

دامن میں کیوں مرے وہ خس و خار بھر گئے
اوروں کو کیوں دیئے ہیں ثمر سوچنے لگے

ان دیکھی وادیوں کا جو در پیش ہے سفر
کیسے ملے گی راہ گزر سوچنے لگے

شعلے لئے بہار جو آئی تو ہم فرید
کیا ہوگا رنگ و بو کا اثر سوچنے لگے

○
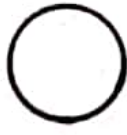
حرفِ امکاں منجمد ہے پتھروں کے درمیاں
اِک زمرّد پوش منظر بنجروں کے درمیاں

چل دیا کس سمت وہ اسپِ ضیاء کا شہسوار
کر کے مجھ کو قید تیرہ منظروں کے درمیاں

بھول بیٹھا ہوں میں اب خارہ تنگانی کا مزاج
چین آتا ہے مجھے شیشہ گروں کے درمیاں

بے کسی کی اہمیت شاید سمجھ میں آ گئی
ڈھونڈتا ہوں اب میں گھر اجڑے گھروں کے درمیاں

ٹوٹتی دیوار کا سایہ بھی آخر چھن گیا
زندگی سستا رہی ہے خنجروں کے درمیاں

دیوار کیا ایک در نہ رکھا
اب شہر میں کوئی گھر نہ رکھا

اشجار ہوا نے رکھے باقی
شاخوں پہ کوئی ثمر نہ رکھا

گردِ سفر تک چُرا گیا وہ
ہمرہ اِک ہمسفر نہ رکھا

کرتب یہ ہوا نے کیا دِکھایا
فانوس چراغ پر نہ رکھا
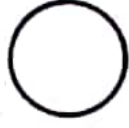
خوں گشتہ خواہشوں کا وہ اثبات کر گیا
اچھا ہُوا کہ شکوۂ حالات کر گیا

سمجھا بجھا کے خود کو وہ لایا ہے راہ پر
دُنیا سمجھ رہی ہے کرامات کر گیا

کشکول ہاتھ میں لئے بابا بھی چل دیا
بستی میں کون پاسِ روایات کر گیا

بستی کے سارے لوگ گھروں سے نکل پڑے
اِک شخص زلزلوں کی یہاں بات کر گیا

اے روشنیٔ طبع ذرا اُنکا ساتھ دے
برباد جسکو شوقِ ملاقات کر گیا
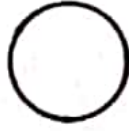
بادو باراں جو بے پناہ ہوئے
نو دمیدہ شجر تباہ ہوئے

جنکی زنبیل میں ہیں شمس و قمر
ساتھ ہم اُنکے گاہ گاہ ہوئے

چند لمحات تھے جو حاصلِ زلیت
وہ سبھی صرفِ اشک و آہ ہوئے

ہم کہ محروم ہیں چراغ سے بھی
وہ کہ سورج کے بادشاہ ہوئے

شب کو دیکھا تھا خواب میں اس نے
مشتعل سائے داد خواہ ہوئے

○

شجر حجر کو رہینِ عذاب کہلوں گا
میں بھاگتے ہوئے سایوں کو خواب کہلوں گا

بچا سکوں تو بچا لوں انا گزیدہ وجود
امیرِ شہر کو خانہ خراب کہلوں گا

ورق ورق یہ حقیقت غریقِ آب کروں؟
کہ بے بھروسہ ہے دِل کی کتاب کہلوں گا

سڑک سڑک نہ پھرایوں وجودِ خستہ مرا
بچھڑنے والے کِسے ہم رکاب کہلوں گا

خزاں رسیدہ کلی ہی سہی جو ہاتھ لگے
میں خود فریب ہوں تازہ گلاب کہلوں گا

وہ موسمی پرندہ نہ لوٹا ابھی تلک
ہے فرشِ راہ چشمِ تمنا ابھی تلک

جسکی تلاش مجھ سے بچھڑ کر چلی مجھے
کچھ بھی لگی نہ ہاتھ وہ دُنیا ابھی تلک

ہر سنگِ میل دیتا ہے اذنِ سفر مجھے
شاید اسی سبب سے نہ ٹھہرا ابھی تلک

ل علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل زاں علم بہ بود بسیار (حکیم سنائی)

○
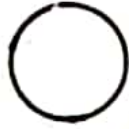
تُجھکو کیا دُوں گا نہ خُوشبُو ہے نہ شبنم اور نہ رنگ
میرے دامن میں، بجز موجِ ہَوا کُچھ بھی نہیں

بس کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں سے ہُوا ہے میرا قتل
لوگ کہتے ہیں کہ "تیرا خونِ بہا" کچھ بھی نہیں

بادلوں کی دوستی میں لوگ پیاسے رہ گئے
آتے جاتے موسموں سے اب گِلہ کچُھ بھی نہیں

پرِ شکستہ ایک طائر سوچتا ہے، قید میں
دام و دانہ کے سِوا باقی بچّا کچھ بھی نہیں

●●

نہ پوچھو کس طرح اب تک جلا ہوں
ہوا کے دوش پر میں اک دیا ہوں

خفا مجھ سے ہیں سارے سونے والے
خطا میری یہی ہے جاگتا ہوں

کسی دامن نہ آنچل ہی کا سایہ
ہواؤ! کس نگر میں آگیا ہوں

مجھے غم ہے اگر تو بس یہی ہے
کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں لٹ گیا ہوں
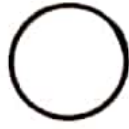
تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرگھٹ کے دیئے کی طرح جلتا ہوں اکیلا

مانا کہ میرے پاؤں لہو رنگ ہوئے ہیں
حالات کے کانٹوں کو مسلتا ہوں اکیلا

غالب نہیں احساس بھی پس پائی کا مجھ پر
ٹھوکر سے جو گرتا ہوں سنبھلتا ہوں اکیلا

ہر شام تھکن ساتھ لئے لوٹتا ہوں گھر
ہر صبح کسے ڈھونڈنے چلتا ہوں اکیلا

پُرکیف فضاؤں سے فرید اب یہ کہے کون
تپتے ہوئے صحراؤں میں پلتا ہوں اکیلا

●●
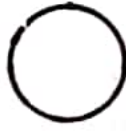
جنوں کے پاؤں تلے چڑھتی سیڑھیاں نہ نکال
حصارِ باغ سے خوش رنگ تتلیاں نہ نکال

کہیں نہ راہ میں اُلجھن اُنہیں سے بڑھ جائے
گھروں سے ہاتھ میں خوابوں کی سونٹیاں نہ نکال

نہ جانے اہلِ ہوس کس نظر سے دیکھیں انہیں
بغیرِ پردہ تمنا کی بیٹیاں نہ نکال

علاجِ درد میں اتنا نہ مر تو لذت پر
چبھی ہیں پاؤں میں تیرے جو سوئیاں نہ نکال

فساد ہو نہ بپا پھر سکوں کے ساحل پر
اداسیوں کے سمندر سے مچھلیاں نہ نکال

فرید بیچ کے اپنا ضمیر سستے میں
چلی ہے رسم کہ آنگن میں لڑکیاں نہ نکال

فریدنامہ

(رباعیات)

تحسین کے تحفے مجھے صائبؔ دیتا
شاباش مجھے عرفیؔ و طالبؔ دیتا
فن کی مرے داد آج جو زندہ ہوتے
یا شاہجہاں دیتا یا غالبؔ دیتا

○ ——— صادقین
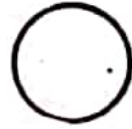
اوروں کے معنیٰ پہ بڑھا کر تمہید
پھیلائی مضموں کی زنجیر فرید
گفتم سخنے لیک پس از کسبِ کمال
خواہی فہمید چوں نہ خواہی فہمید

٥ ——— شمس الرحمٰن فاروقی
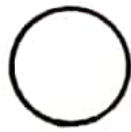
یکتا بھی یگانہ بھی مشہوُد مآل
یکتائی میں تحلیل ہُوا عزّو جلال
حیران تفکّر ہے تحمّل نگراں
دریا میں ہُوا غرق مرا جامِ سفال
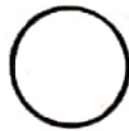
کم زور ہوں تو زور عطا کر مجھ کو
بے طور ہوں تو طور عطا کر مجھ کو
جنگل ہوں عطا کر مجھے شادابی
برسات ہوں تو مور عطا کر مجھ کو

○
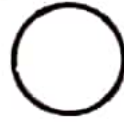
اک تیر عطا کر دے مجھے زد کے لئے
وسعت بھی عطا کر دے مجھے حد کے لئے
مشکل مری آسان بنا دے یارب!
آسان کو مشکل نہ محمدؐ کے لئے

○
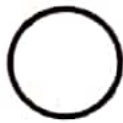
حالات سے سمجھوتہ کرایا اُس نے
جو گھر بھی مِلا اُس کو وہ ڈھایا اُس نے
تعمیر کے پہلو میں کیا تخریب کا کام
پھونکوں سے دیا دِل کا بُجھایا اُس نے

○

دِل غم سے ہے بھرپور نِگا ہوں میں تھکن
کم کم ہی مزا دیتا ہے اب سَیرِ چمن
اے صُبحِ وطن پوُچھ نہ تو وجہِ ملال
ویں حرفِ معمّہ نہ تو خوانی و نہ مَن[1]

○

---
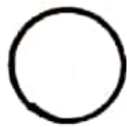
[1] حکیم عمر خیام

جینے سے ہراساں موت کا ڈر رکھتا ہُوں
بنیاد ہوا پر ریت کا گھر رکھتا ہُوں
جن لوگوں سے پھولوں میں تُلا جاتا تھا میں
اُن لوگوں سے اُمیّدِ خنجر رکھتا ہُوں

○

اِک پیڑ کہ جس پر کوئی پتّہ ہے نہ پھُول
رہتا ہُوں میں اُس پیڑ کی چھایا میں ملول
حیرت کے سوا زیست کا حاصل کیا ہے
اس فلسفہ سے دِل کو ہے لگانا ہی فضُول

○
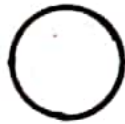
ٹوٹی ہوئی تلوار نظر آتی ہے
سائے سے یہ بیزار نظر آتی ہے
اے زیست کے سائے میں اُچھلنے والو
کاندھے پہ مجھے بار نظر آتی ہے

بے وجہ کبھی اپنے مُقابل اَڑنا
شاید کہ اِسے کہتے ہیں حد سے بڑھنا
اِس کشمکش ذات کے گرداب کے بیچ
سیکھا ہے کہاں سے یہ ہَوا سے لڑنا

ہاں اُس نے مجھے چھوڑ کے با حالِ تباہ
گہ کنویں جھنکائے ہیں اور گاہے چاہ
یہ حال ہوا ہے میرا بربادی سے
اب خود سے بھی ہوتا نہیں مجھکو نباہ

○

ایسے بھی بھرا عُمر کا کوزہ خالی
ہر غم سے بچنے کی یہ راہ نکالی
اپنوں نے سُنی جب نہ میری کوئی بات
پھر خود سے تکلّم کی عادت ڈالی

○

مفہوم طلب عرض نہ غایت ہوگی
جز ایں کہ پذیرائیِ کلفت ہوگی
انصاف کے والی یہ ذرا بتلا کب؟
بے جُرم اسیروں کی سماعت ہوگی

○

ہر چند لڑے موجِ بلا سے مجبور
تھم جائے! ہو جب آئینۂ ہستی چور
یہ بحرِ محبت ہے نہایت ہی عمیق
تنکوں کی تعاقب میں نہ چل اتنی دور

○
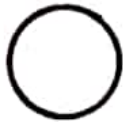
مسجد کے مناروں سے پوچھا میں نے
مندر کے کواڑوں سے پوچھا میں نے
جب بن نہ پڑا اُن سے بھی درمانِ حیات
میخانے کی دراڑوں سے پوچھا میں نے

○

دیتا ہوں خس و خارِ چمن کو ترتیب
سوجی ہے جلانے کی اپنے ترکیب
مشہور لگے کرنے مرے ہم مسکن
تعمیر نشیمن کی یہ ہے اک ترغیب

○
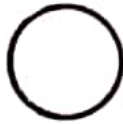
پسِ نوشت

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی
حدیثِ خلوتیاں جز رمز و ایماء نیست

مرزا غالب

آراء

● ——— فرید پربتی کا مزاج کلاسیکی اور تہذیبی عناصر سے متاثر ہے۔ زبان کے استعمال میں بھی آپ بڑے نظم وضبط سے کام لیتے ہیں۔ آپکی ردیفیں اور قافیے انتہائی مستحکم ہیں۔ غزل کے عمومی لب ولہجے میں اِستعاراتی اِمکانات تلاش کرنے کے علاوہ کہیں کہیں ٹھوکا تفصیل سے بخوبی کام لیاہے۔ فرید کی غزلوں کا اِنسان حساس اور درد مند ہے۔ اور عصری انسان" اور" بنیادی انسان" کی روحانی کشاکش پر بار بار نظر ڈالتا ہے۔ اور خود جذباتی اور ذہنی کرب کے مراحل سے گزرتا ہے بحروں کے انتخاب میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔

بلراج کومل

کالکاجی۔ نئی دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء

● ——— فرید پربتی ریاست جموں وکشمیر کے ایک نوجوان شاعر ہیں، ان کی شاعری میں زندگی کی ناآسودگی اور حال و مستقبل کی بے یقینی کا شخصی اظہار ہوا ہے، وہ اپنے تجربے کی لرزیدہ دستک سے قاری کے دل میں داخل ہونے اور اس میں ہیجانی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کا ذہنی اور احساسی رویّہ عصری صورت حال کا پروردہ ہے۔ ابھی سے فرید کے یہاں بھیڑ سے الگ ہونے کی خواہش موج زن ہے۔ پٹی ہوئی لفظیات کا سہارا لینے کی بجائے وہ ایسی لفظیات کی تلاش کرتے ہیں جس میں ان کے بطون کی آواز سما سکتی ہو۔ یہ لہجہ کھردار سہی، لیکن غیر حقیقی نہیں ہے۔ اپنی آواز کا ڈھونڈنے کے لئے شاعر کو غیر معمولی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اس سخت کوش مرحلے سے اگر فرید پربتی سلامت روی سے گزر گئے تو یقیناً وہ اس منزل کو پالیں گے جس پر ان کی نظر ہے۔

مظہر امام

- سرینگر، ۲ نومبر ۱۹۸۷ء

● ـــــــ فرید پربتی کی عمر اور اُٹھان دیکھکر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فرید ریاست جموں وکشمیر کے جدید تر شعراء کی نسل کے 'میر کارواں' ہیں، اُنکی پیاری پیاری بھولی بھالی شخصیت کی طرح اُنکا کلام بھی پاک وصاف ہے۔

پریم کمار نظرؔ

ہوشیار پور۔ ۱۹ مئی ۱۹۸۸ء

● ـــــــ نوجوان شاعروں میں فرید پربتی بچپن سے شعر وشاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔ انکا مزاج اگرچہ کلاسیکیت آمیز ہے۔ لیکن جدید اسلوب کی پرچھائیاں اُنکے کلام میں حسّی گہرائی بھی پیدا کردیتی ہے۔

کشمیر میں اردو شاعری ۴۷ء کے بعد ص ۱۶۰

محمد یوسف خان عادلؔ۔ سرینگر کشمیر۔

● ـــــــ فرید پربتی ایک نوآموز شاعر ہیں۔ اُنکی غزلیں حُسن اور تازگی سے معمور ہیں اُنکی غزلوں میں وہی درد کسک، فرد کی محرومی، موجودہ زمانے کا آشوب اور تڑپ اور گداختگی پائی جاتی ہے۔ فرید غزل کے شاعر ہیں۔ اسلئے اپنے رنگارنگ خیالات کو غزل کے سانچے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جدید غزل گو شعراء سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے روایتی شاعری سے کنارہ کشی اختیار کی ہے۔

ابرِ تر میں شامل غزلوں میں حسن وعشق کا ایک دلفریب امتزاج ملتا ہے ایسا لگتا ہے کہ محبوب کی اداؤں نے اُنکے دل کو داغ داغ بنا دیا ہے اور اب وہ بے بس ہو کر اختر شماری کرنے لگتے ہیں۔ فرد کی محرومی، موجودہ دور کا درد وکرب، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور آئے دن پیدا

ہونے والے مسایل اور انکی پیچیدگیاں فرید کے اہم موضوعات ہیں وہ پہلے حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر انکو تجربات کی سان پر چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہیں نہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا
نجانے لیکے کہاں مجھکو آگئی ہے ہوا

یا

یہ نہیں پہچان سکتا ہوں میں اب
تھا کہاں پر شہر میں میرا مکاں

فرید پربتی کی شاعری ابھی ابتدائی منزلوں سے گزر رہی ہے لیکن اسمیں جو تازگی اور توانائی ملتی ہے وہ ایک اچھے شاعر کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔

پریمی رومانی

ماہنامہ "شیرازہ" سرینگر شمارہ ۱۰ جلد ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۹ء
جموں و کشمیر اکیڈمی سرینگر

● ——— فرید پربتی کی شاعری انکی شخصیت کی طرح مضبوط اور توانا ہے اور روشن امکانات لئے ہوئے ہیں۔ خدا اُن کی صلاحیتوں کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔

مرغوب علی نجیب آباد۔ یو۔پی ۲۱۔ نومبر ۱۹۸۸ء

● ——— فرید پربتی کی فکر عصری آگہی اور تاریخی عرفان سے متصف ہیں۔ اُنکے فکر، فن اور شعور میں جو توازن اور امتزاج پایا جاتا ہے اُسکی مثال ابر، ہوا اور پربت کی سی ہیں۔ جو ہر موسم میں ہم رشتہ ہوتے ہیں۔

عبد الجبار نقوی

عابد علی روڈ، حیدر آباد۔ ۲۲، دسمبر ۱۹۸۸ء

اظہارِ تشکر

میں شکر گزار ہوں

● —— اپنے اساتذہ کرام خصوصاً جناب مخمور بدخشی، قاضی الطاف، ڈاکٹر یونس کول، ڈاکٹر نور احمد خان (علیگ) ڈاکٹر فیاض احمد شیر گڈامی کا جو میرے کلام کو اپنے لئے کحل الجواہر سمجھتے ہیں۔

● —— اپنے احباب میں سے مخمور سعیدی، اسعد بدایونی، شبیر رسول، فاروق شاہ، شفقات احمد شیخ، ڈاکٹر یوسف سلیم، رخسانہ جبیں، ہلال فرید، مشتاق مہدی، الطاف ناڈپوری عبید صدیقی کا جو میری تازہ تخلیقات کے منتظر رہتے ہیں۔

● —— ریاستی اکاڈمی کے ارباب حل و عقد کا جنہوں نے اس مجموعہ کی اشاعت کو ممکن بنادیا۔

● —— جناب الطاف ملک کا جنہوں نے اس مجموعے کے گرد پوش کا ڈیزائین بنایا۔

● —— اپنے ان تمام قارئین کا جو میرے کلام پر غور و فکر کرتے ہیں۔

—— فرید پربتی

....

(شعری مجموعہ)

فرید پربتی

ناشر

• مکتبۂ علم و ادب، ریڈ کراس روڈ، سرینگر کشمیر

ملنے کے پتے

• مکتبۂ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی ٢٥

• شب خون کتاب گھر، ٣١٣۔ رانی منڈی، الہ آباد

• ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ٦

فرید پربتی نئی غزل کے شاعر ہیں، نئی غزل موجودہ دور
کے بحران کی تجسیم کاری کیلئے لفظ و پیکر کے علامتی امکانات کو
حتی الامکان بروئے کار لاتی ہے، فرید پربتی نہ صرف موجودہ
بحرانی صورت حال کا احساس رکھتے ہیں بلکہ وہ الفاظ کے ایمائی
امکانات کی کھوج لگانے کی ضرورت کا بھی شعور رکھتے ہیں۔

حامدی کاشمیری